آ گئیں۔ اس سے پہلے مجھے احساس نہ ہوا تھا کہ یہاں کوئی اور بھی موجود ہے۔ ڈاکٹر فاضلی اور شمس تہہ خانے میں بیٹھے تھے۔

بابا جلال ہمیشہ کی طرح دسترخوان بچھانے میں مشغول تھا۔ عفت نے شمس کی طرف دیکھا۔ پھر چیرنی نے جی طرف نظر اٹھائی۔

''ٹھیک ہو جائے گی بی بی۔ آپ فکر نہ کریں اشفاق صاحب۔'' بابا جی مسکرا کر بولے۔

''کیوں پُت بھوک لگتی ہے۔''

''نہیں بابا جی۔''

''لگے گی لگے گی انشاءاللہ۔ ہم دوائی دیں گے۔ رب اس میں شفا شامل کر دے گا۔''

بابا جی پھر تھسو تھسو کر کے چلے گئے۔ کمرے میں سے سانتا کلوز چلا گیا۔ چھوٹی چھوٹی آرزوؤں کو کھلونوں میں پیک کر کے لمبی لمبی جرابوں میں گھر گھر لے جانے والا سانتا کلوز جو ہمیشہ چمنی کے راستے، آدھی رات کو کرسمس آیا کرتا ہے اور ہر گھر میں رات کے اندھیرے میں پلنگ کے ساتھ جراب باندھ کر رخصت ہو جاتا ہے...... مسکراتا ہوا بابا۔

بچوں کے لیے کھلونے، عورتوں کے لیے ملبوسات، سینٹ کی شیشیاں، میک اپ کا سامان۔ مردوں کے لیے اخروٹ کی لکڑی کے پائپ، گھڑیاں، شمپین کی بوتلیں وغیرہ وغیرہ۔ سانتا کلوز نے اپنے لیے کبھی کچھ نہیں مانگا۔ گھروں پر آہستہ آہستہ گرتی ہے اور فضا میں حمدیہ گانوں (Cardl Singing) کی آواز مدہم پڑ جاتی ہے تو ...ہے۔ رات کے پچھلے پہر۔

مغرب کا سانتا کلوز ایک خوبصورت Ritual کی روایت تھی۔ اس نے کرسمس کے تہواروں کو انتہائی قابلِ تقلید بنا دیا ہے۔

ڈیرے کا بابا ایک اور قسم کا سانتا کلوز تھا، جس نے حال کی گھڑی پر ایک اور قسم کا سماں باندھ رکھا تھا۔

بابا جی کے جانے کے بعد ہم اٹھ کر شمس اور ڈاکٹر فاضلی کے پاس جا بیٹھے۔

شمس نے اگر عینک نہ پہن رکھی ہوتی تو اس کا لٹکتا ہوا چہرہ حضرت عیسیٰؑ کی ان شبیہوں سے ملتا جو یورپ کے آرٹسٹ بنایا کرتے ہیں۔

دراز قد سانولے ڈاکٹر فاضلی نے بڑی رواں انگریزی میں شمس سے باتیں شروع کر رکھی تھیں۔ عفت تھوڑی دیر کے بعد غنودگی کا شکار ہو جاتی، ان باتوں کی ٹوہ میں چوکس بیٹھی تھی۔ یہ ساری مخلوق کیسی تھی؟

شمس مکمل عقیدت بنا بیٹھا تھا۔ دراز قد ڈاکٹر فاضلی نفس کشی کے باوجود اپنے اندر کہیں انا کا ست رکھے نظر آتا تھا۔ وہ دونوں بے تکان انگریزی میں ''سکینۃ الاولیاء'' کی باتیں کیے جا رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب تفسیر بیان کر رہے تھے۔ مسئلہ جبر و قدر کو آسان مثالوں سے بیان کر رہے تھے۔ شمس مجسم حیرت بنا ان کی باندھے، کلیجہ شق کیے حاضرِ خدمت تھا۔ اس وقت سارا علم نگاہوں سے کانوں سے اندر اتارنے کی گھڑی تھی۔

بالآخر شمس نے کہا۔ ''ہم مغرب والے بہت بیمار ہو چکے ہیں ڈاکٹر صاحب! ہماری روح کو کئی قسم کے کیڑے گئے ہیں۔ ہم ڈارون کی طرح صرف بگ بینگ پر یقین رکھتے ہیں۔ ہم یہ جان ہی نہیں سکے کہ زندگی کسی خدا نے بھی ہوگی۔ ہم نے Sex کو فرائیڈ کی طرح اپنے اوپر سوار کرلیا ہے۔ اب جنس کی آرزو پوری کرنا ہی اہم ہے۔ جنس کا نفسیاتی امراض کو دعوت دینے کے برابر ہے۔''

کارل مارکس نے بھوک اور غریبی کا جو علاج کیا ہے۔ اس کے نزدیک یہ واحد علاج ہے۔ ہم کارل مارکس کو والے جان ہی نہیں سکتے کہ خدا رزق دیتا ہے۔ کسی کو زیادہ کسی کو کم۔ اسی امتحان میں وہ انسان کو مبتلا کرتا ہے کہ کون رازق ہے حضرت عثمانؓ کی طرح آخرت خریدتا ہے اور کون نہ ہونے کے مقام پر پیٹ پر پتھر باندھ کر سوتا ہے اور نہیں کرتا۔

دراز قد ڈاکٹر نے بڑی ملائمت سے کہا۔ ''ناں صاحب ناں۔ سائنس بھی اللہ کی عطا کردہ نعمت ہے لیکن افسوس ترقی دور تک نہیں جاتی۔ اوپر والے کی مرضی، ایک وقت پر وہ کس قدر علم عطا کرے۔''

شمس نے روہانسی آواز میں کہا۔ ''ہم بکھر رہے ہیں ڈاکٹر صاحب! کبھی آپ نے سوچا کہ سفید فام قوموں میں نبی پیدا ہوتے؟ کبھی نہیں سوچا ہوگا۔ یہ ساری عطا برادن سیاہ قوموں پر کیوں؟ میں بتاؤں سفید لوگوں میں کمی ہے۔ وہ Humble ہونا نہیں جانتے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جو کچھ وہ جانتے ہیں اور کوئی نہیں جان سکتا۔ ہماری خود یہ عالم ہے کہ ہم اگر حضرت عیسیٰؑ کی تصویر بنائیں گے تو وہ گورا ہوگا۔ ہم یہ بھی نہیں مان سکتے کہ شاید حضرت عیسیٰؑ ہوں گے۔ ڈارون، فرائیڈ اور کارل مارکس نے تو مغربی سوچ کا بھٹہ ہی بٹھا دیا ہے۔''

''ناں جی ناں ایسا نہ کہیں۔ یہ علم بھی اسی کا عطا کردہ ہے۔''

''بسم اللہ کیجیے۔'' بابا جلال نے دسترخوان لگانے کے بعد کہا۔

شمس اور ڈاکٹر صاحب نے اپنے اپنے پیالوں میں شوربہ ڈال لیا اور آہستہ آہستہ کھانے لگے۔

''آپ بھی لیں اشفاق صاحب۔''

خاں صاحب نے تھوڑا سا سالن ڈال لیا اور مؤدب انداز میں کھانے لگے۔

''کھاؤ بی بی....'' ڈاکٹر صاحب نے فاصلے سے کہا۔

''آپ کھائیے مجھے بھوک نہیں۔'' عفت بولی۔

''دو لقمے سہی، ہمارا کھانا پاک ہو جائے گا۔''

''پاک ہو جائے گا...... یہ کیا منطق ہے؟''

''بابا جی کا کہنا ہے جو آدمی اپنے کھانے میں سے کسی کو کھلاتا ہے، وہ اپنا کھانا پاک کر لیتا ہے۔ بڑے بڑے اولیائے کرام، قطب اولیاء کا یہی مسلک ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کی روایت ہے جی کھانا کھلانا۔'' شمس کھاتے ہوئے کہنے لگا۔

ہم سب کھانے میں مشغول ہو گئے۔

شمس نے کہا ''ڈاکٹر صاحب! ہمارے معاشرے میں چھوٹی چھوٹی کئی قسم کی بغاوتیں ہو رہی ہیں۔ ہماری

عورتیں اٹھ کھڑی ہوئی ہیں۔ انہوں نے Wilt ..... Red Stocking اور Liberation کی تحریکیں چلائی ہیں۔ انہوں نے صدیوں کی غلامی کا طوق اتار پھینکا ہے۔ صدیوں کی غلامی کے عوض انہیں کیا ملا۔ مرد نے ہمیشہ انہیں اپنے سے کمتر ہی سمجھا اور احساس کمتری میں مبتلا کر دیا۔"

وہ کسی خبریں پڑھنے والے کی طرح کھنک دار آواز میں کہہ رہا تھا۔ "بیبے ڈاکٹر صاحب! مغرب نے دین سے علیحدہ ہو کر نبیوں کے علم پر Secular تعلیم کو ترجیح دے کر اپنے لیے بہت سی مشکلات پیدا کر لی ہیں۔ میں نے مشرقی زاویے، ڈیرے، عبادت گاہوں میں رہ کر سیکھا ہے کہ عورت عارفِ دنیا ہے اور مرد عارفِ مولا ہے۔ دونوں کا سفر الگ ہے، متقابل نہیں۔ دونوں کی سعی مختلف ہے۔ عورت پرورش کے لیے بنی ہے اور مرد کفالت کے لیے۔ چونکہ اسی دنیا کو جننا ہے۔ اس لیے مرد کو عارفِ دنیا کو خوش کر کے دین کا کندن اسی سونے سے تیار کرنا پڑتا ہے۔ عورت چونکہ اللہ کی مخلوق کی پرورش کرتی ہے، اس لیے مختلف قسم کی مصروفیت کے باعث اسے دین عارفِ مولا کے بغیر مل نہیں سکتا۔

دونوں قدم بہ قدم متوازی چلتے ہیں لیکن مغرب میں ایسا وقت آ گیا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے مدِ مقابل ہو گئے ہیں۔ مغرب کا مرد عورت کو یہ احساس دلانا چاہتا ہے کہ عورت جب بھی اس کا مقابلہ کرے گی، منہ کی کھائے گی۔ وہ فطرتاً کمزور اور ناقص ہے۔ مسابقت کی بھینٹ چڑھ جائے گی۔ ادھر عورت پرورش میں خدا کا ساتھی بننے کے بجائے مرد کو نیچا دکھانے پر تلی ہوئی ہے۔ بھلا جب معاون مدِ مقابل بن جائیں گے تو انتشار کے علاوہ کیا ملے گا۔" شمس بلا تکان انگریزی میں بولے جا رہا تھا۔

عفت نے کھانا پینا چھوڑ دیا تھا اور مبہوت اس کی صورت دیکھ رہی تھی۔

"ہمارے سکول، کالج، ہمارا تعلیمی نظام جس پر ہمیں اس درجہ فخر ہے۔ کیسے بچے بنا رہا ہے؟ ہمارے بچے belong نہیں کرتے۔ وہ خالی گھروں میں اپنی چابی سے دروازہ کھولتے ہیں۔ اپنا سیریل بنا کر خود کھاتے ہیں۔ ٹی وی کھول کر ایک لاتعلق Information oriented دنیا میں داخل ہو جاتے ہیں۔ ٹی وی پر کارٹون دیکھتے ہیں اور بڑے سروں والے Giants بن جاتے ہیں۔ ان کا سر اتنا بڑا ہو جاتا ہے کہ کسی دروازے سے نکلنا ممکن نہیں رہتا اور زندگی صرف دروازوں سے نکلنے کا نام ہے۔"

ڈاکٹر صاحب بولے "جانِ من! گھبرائیں نہیں۔ یہ سارا علم بھی اوپر سے عطا ہو رہا ہے۔ آپ جھگڑا نہ کریں۔ اس وقت سفید لوگوں پر اللہ کی طرف سے نئے تجربات ہو رہے ہیں۔ Empirical evidence سے تجربات کر کے سیکھ رہے ہیں۔ بیچارے اللہ کے سفید چوہے بنے ہوئے ہیں۔ اگر اپنے نبی کو گھٹ کے پکڑے رہتے تو زیادہ خواری نہ اٹھانی پڑتی لیکن جیسی اوپر والے کی مرضی۔ جس طرح چاہے وہ جیسا رکھے۔"

جس وقت یہ دونوں بے تکان بول رہے تھے، بابا جی پھر اچانک آ گئے۔ باتیں انگریزی میں ہو رہی تھیں اور بابا جی انگریزی نہیں جانتے تھے۔ پتہ نہیں یہ ٹیلی پیتھی کا کون سا مقام تھا کہ بابا جی نے مباحثہ کو یوں ختم کر دیا۔ "آپ نے بچوں کو علم کی اہمیت ضرور بتا دی ہے لیکن یہ نہیں سمجھایا کہ عقل چراغِ راہ نہیں ہے۔ صداقت چراغِ راہ ہے۔ صداقت ہمیشہ نبی سے ملتی ہے۔ وہ صداقت کا معجزہ ساتھ لاتا ہے....."

باباجی کے ہاتھ میں بادام روغن کی بوتل، سونف کا عرق اور مروارید کی معجون تھی۔

"تو پُت خیر ہو جائے گی۔ اللہ نے چاہا تو بیماری ٹل جائے گی۔ جب پیاس لگے انار کا رس پینا ہے۔ چاہے دو

پھر انہوں نے ہاتھ میں پکڑی تھیلیں خاں صاحب کے سپرد کر دیں اور ان کے استعمال کا طریقہ بھی ان کو

"میں نے تو سنا ہے باباجی موت کا وقت معین ہے۔ یہ ٹل نہیں سکتی۔" عفت نے پوچھا۔

"ٹلتی ہے پُتی ہے، وہ کسی بات کا پابند تھوڑی ہے۔ وہ اپنے ولیوں کو کرامت اور اپنے نبی کو معجزہ عطا کرتا ہے۔ دعاؤں کی برکت سے بہت کچھ ٹلتا ہے۔ زندگی کا وقفہ لمبا ہوتا ہے۔ موت کی گھڑی ٹلتی ہے۔"

"لیکن کیسے حضور؟ کیسے؟" عفت نے سوال کیا۔

"پُت! ہمارا قصائی موت کے شکنجے میں آیا ہوا تھا۔ گھر والے اسے رو پیٹ چکے تھے۔ پھر اس کا جوان بیٹا ہاتھ جوڑے ہمارے پاس آیا اور کہنے لگا۔۔۔ باباجی! حریص ہوں، حرص کی بات کرنے آیا ہوں۔ جانتا ہوں میرا باپ کافی جی چکا ہے لیکن دل اس کی موت پر راضی نہیں ہوتا۔ اگر آپ کا کوئی چارہ لگتا ہے تو لگا لیجیے۔ ہمارے بس سے تو بات نکل چکی ہے، اللہ کا حکم ہو گیا مانگو، ہم قصائی کے گھر پہنچے۔ بڈھے قصائی کے زخرے سے موت کی آواز آ رہی تھی۔ چہرے پر زردی چھایا تھا۔ آنکھوں کی جوت ختم ہو چکی تھی۔ ہم نے اپنے رب سے دعا کی، ربا اسے بخش دے تو آخری حکم، آخری ہے۔ تجھے کسی نے پوچھنا نہیں۔ تجھے کون سوال جواب کرے۔ ڈیرے پر تیری خلق روٹی کھاتی ہے۔ یہ قصائی اچھا بندہ ہے۔ ابھی اس کی ضرورت ہے۔ تیری داڑھی ہتھ لگایا۔۔۔۔۔ جانے دے ہمارا مان رکھ لے۔ لو پُت وہ دوسرے دن بیٹھا دکان پر۔۔۔۔۔ ابھی تک اسی کی دوکان سے گوشت آتا ہے۔"

"جب سے یہاں آئی ہوں مجھے ہر وقت نیند آتی رہتی ہے باباجی۔۔۔۔۔ کیا کروں؟"

"خیر ہو گئی پت خیر ہو گئی۔ اب ہمیشہ آرام سے سوئے گی دھی رانی۔ انار کے رس سے غفلت نہیں برتنی۔ پُت جو ہوا ہے اس نے موت کا ذائقہ چکھنا تو ضرور ہے۔ ہم تو مہلت مانگتے ہیں۔ وقت ٹالنے کو کہتے ہیں۔ وہ ضدی کی ضد مان لیتا ہے بس۔"

کمرے میں جو بھی موجود تھا اس بات کا آرزومند تھا کہ عفت آرام سے بیٹھے، صحت مند ہو جائے۔ میں تھوڑی تشکیک کا شکار تھی۔ بھلا انار کا رس، بادام روغن اور ایک معمولی سی مروارید کی معجون فیل ہوتے گردوں کا کیسے علاج ہو سکتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہیں یہ مرید پھانسنے کا طریقہ نہ ہو۔ عین ممکن ہے خاں صاحب کی پوزیشن کا ڈیرے پر اثر ہو گیا ہو۔ اتنی غیر فطری محبت سے مجھے عجیب قسم کی وحشت ہو رہی تھی۔ کیا یہ خوشامد تھی؟ کیا خیر خواہی اسی طرح مفت بھی مل سکتی ہے؟

ڈاکٹر صاحب بولے۔ "اپنے باباجی کہا کرتے ہیں کہ اگر آپ طیب خوراک کھانا چاہتے ہیں تو اس میں تھوڑا سا کسی اور کو بھی کھلایئے۔ اگر اپنی روزی پاک کرنا چاہتے ہیں تو اپنی کمائی میں کسی اور کو بھی شریک کیجیے۔ جب اپنے گھر کے لیے سودا خریدو تو کسی بیوہ، کسی سفید پوش، ضرورت مند کے لیے بھی اسی قدر سودا سلف بھجوا دیا کریں۔ اپنے بچوں کی تعلیم

پاک کرنی ہو تو ویسے ہی کسی یتیم، نادار کے بچے کی تعلیم مکمل کروا دی۔ اس کی کتابوں، فیس، یونیفارم کے ذمہ دار ہو گئے لباس پاک کرنا ہو تو پہلے دو جوڑے سلوا کر دے دیئے۔ پھر اپنے جوڑے بنوائے۔''

''پتہ ہے ایک دھویا ایک پہن لیا۔'' ایک مرید کونے میں سے بولا۔

''ناں جانِ من ناں..... ایک خود پہن لیا، ایک کسی ایسے شخص کو دے دیا جو سلائی بھی نہیں دے سکتا۔ نئے سے اس کی عید ہو گئی۔ آپ کا جوڑا پاک ہو گیا۔''

یہ تو میں جان گئی تھی کہ ڈیرے کا قاعدہ تھا کہ جونہی کوئی حاجت مند تکلیف کی سواری پر سوار ادھر آتا اس کے مرض کی تشخیص سے پہلے دسترخوان بچھ جاتا ہے۔ اس دسترخوان پر ہر چیز کا لطف، رنگ، لذت موجود ہوتی جیسے ماں کے دودھ میں کسی آمیزش کا گمان نہیں ہوتا۔ یہ کھانے بھی شیر مادر کی طرح محبت کی چاشنی سے بھرے ہوتے۔ کھانے کے کھانے سے پہلے ہر وقت گجراتی روغنی پیالوں میں کیکر کی چھال سے بنی گڑ کی چائے آتی۔

''آپ کے ڈیرے نے مجھے حیران کر دیا ہے ڈاکٹر صاحب۔ تواضع کا یہ معیار بیسویں صدی میں کہیں نہیں۔'' عفت بولی۔

''بی بی یہاں سب کچھ صداقت پر مبنی ہے۔ ہر قول کا فعل شاہد ہے اور ہر فعل پر کسی شاہد کی نظر ہے۔''

خاں صاحب تو ایک عرصہ سے یہاں آتے رہتے تھے۔ وہ یہاں کی Terminology سے خوب واقف تھے لیکن میرے لیے فعل، شاہد، صداقت..... اور ایسے ہی دوسرے الفاظ بالکل نئے تھے اور میں نے انہیں ان معنوں میں استعمال نہ کیا تھا۔

''کیا یہاں ڈاکٹر صاحب ہر طرف خیر ہی خیر ہے؟'' عفت نے حیران سا ہو کر پوچھا۔

''جی نہیں...'' ڈاکٹر صاحب نے قطعیت سے جواب دیا۔

اشفاق صاحب یوں مسکرائے جیسے جواب پہلے سے جانتے ہوں۔

''کیا مطلب؟'' عفت نے سوال کیا۔

''کبھی آپ نے مقناطیس کا چھوٹا سا ٹکڑا دیکھا ہے۔ اس ٹکڑے کے دو حصے ہوتے ہیں شمالی قطب جنوبی قطب..... مقناطیس کو درمیان میں سے کاٹ کر دیکھیے اور کوشش کیجیے شمالی اور جنوبی قطب علیحدہ ہو جائیں، آپ دیکھیں گے کہ نئے دو ٹکڑوں میں پھر شمالی اور جنوبی قطب پیدا ہو جائیں گے۔ آپ مقناطیس کو کاٹنے کے عمل سے چھوٹا کرتے جائیں تو مقناطیس کے آخری مولی کیول میں بھی ایک سرا شمالی اور دوسرا جنوبی قطب ہو گا۔

انسان کا بھی یہی حال ہے بی بی۔ اسے خیر اور شر دونوں سے بنایا گیا ہے۔ اس میں آگ اور پانی بیک وقت موجود ہوتے ہیں۔ گو ایک دوسرے کی ضد ہیں لیکن چراغ اندھیرے کے بغیر روشن نہیں ہو سکتا نہ خوشنما ہی لگتا ہے۔ ایک بات ہے کچھ اللہ کے بزرگانِ دین اپنے شر کو اپنے نفس کو شیطان کی ترغیب کو اپنے اندر کے خیر کے تابع کر لیتے ہیں یہی سب سے بڑی کرامت انسانی ہے۔ کتا موجود ہو لیکن زنجیر سے بندھا رہے۔ بھونکے تو ضرور صرف کاٹ نہ کھائے۔''

شمس نے اپنے کرتے سے ہاتھ پونچھ کر سوال کیا۔ ''میرے لیے کوئی راستہ؟''

''ہر تلاش کرنے والے کے لیے راہ ہوتی ہے۔''

شمس نے آہ بھر کر کہا۔''ہاں بشرطیکہ وہ جانتا ہو کہ وہ کیا تلاش کر رہا ہے؟''

''آرزو ہو تو راستہ خود بخود دکھائی دے جاتا ہے برادر.....'' ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا۔

''میں نیویارک کا رہنے والا ہوں۔ میری ماں اوپرا سنگر تھی۔ میرا باپ سکول ماسٹر تھا۔ بچوں کو تعلیم دیتا، ڈسپلن سے بڑے لوگوں کی مثالیں دیتا۔ ان کے علم کی خوشہ چینی کرتا۔ وہ ایک معمولی Clergyman کی طرح اندر سے پکا تھا۔ دوسروں کو سیدھا کرتے کرتے وہ خود کبڑا ہو گیا تھا۔ گھر، باغ، غسلخانہ ہر جگہ اس کی جماعت کا کمرہ تھا لیکن ماں کے گلے میں ایک آزاد پرندہ تھا۔ کبھی کبھی وہ باورچی خانے میں برتن اٹھاتے، سبزی کاٹنے کے وقت گانے لگتی تو میں چاہتا میں اس کی آواز کے ساتھ سُروں سے ارتعاش کے ساتھ فضاؤں میں گم ہو جاؤں۔ کیا خیال ہے آپ کا۔ کیا جسم کے ساتھ کائنات کا سفر کر سکتا ہے؟ کیا وہ کسی بلیک ہول میں تو ختم نہیں ہو جائے گا؟''

''آپ کے پاس شب معراج کی شہادت موجود ہے۔ ویسے تو اب لوگ Levitation کو بھی سائنس بنانے لگے ہوئے ہیں لیکن کبھی کبھی میں اپنی تعلیم کی وجہ سے تشکیک کا شکار ہو جاتا ہوں۔ جس Data کو لیبارٹری میں نہیں لے جا سکتے اس پر کچھی ایمان نہیں لایا جا سکتا، ہم جیسے لوگوں سے۔'' شمس بولا۔

میں نے دل میں ڈاکٹر صاحب کی بات سے اتفاق نہ کیا۔

''میں بھی اس ڈیرے پر تشکیک کا تیزاب لے کر آیا تھا۔ بڑے جگرے دل کا آدمی تھا میں...... لیکن...... بابا جی نے میری سئی گم کر دی۔ میرا تیزاب شہد بن گیا۔ اخلاق ہی معیار ہے۔ اسی کی انچی ٹیپ سے فٹ بھی ناپے جاتے ہیں اور گز بھی۔ سیدھا کرنے کے لیے ہمیشہ اخلاق کی داب کام آتی ہے۔ معیار کامیاب آدمی نہیں۔ معیار اچھے اخلاق والا انسان ہے۔''

''آپ کون ہیں ڈاکٹر صاحب؟'' عفت نے سوال کیا۔

''میں ضلع فیصل آباد کا رہنے والا ہوں۔ میرے آباؤ اجداد پشت با پشت سے ہل جوتتے، فصلیں بوتے، کاٹتے آئے ہیں۔ ان کسان لوگوں کو اللہ کی رحمت بادلوں میں نظر آتی رہی ہے۔ وہ رحمت کی تلاش میں اوپر دیکھتے آئے ہیں۔''

''عفت پوچھتی ہے ڈاکٹر صاحب! پھر سوچ کر جواب دیجیے، آپ کون ہیں؟'' شمس نے سوال کیا۔

شمس کی نیلی آنکھوں میں آنسو تھے۔''تو آپ اتباع رسولؐ کے پیروکار ہیں۔ واقف منزل ہیں آپ؟ آپ جانتے ہیں کس راستے پر چل کر انسان معراج کو پہنچ سکتا ہے؟''

''ہاں چلتے رہنا شرط ہے۔ یہاں وہاں منزل کا تعین نہیں۔ بس اس راستے پر کبھی Pedestrian (راہ رو) کوئی دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس نے منزل پالی۔''

شمس نے اپنے آپ کو جھنجھوڑ کر کہا۔''بس ڈگمگانا نہیں۔ چلتے رہنا اپنی رہنمائی کرتے رہنا۔ اپنے آپ کو حوصلہ دے کر چلنے پر آمادہ کرتے رہنا ڈاکٹر صاحب۔ ابھی مجھ سے میرے ہم شکل میرے کئی ہم وطن ادھر تلاش میں آئیں گے۔

میرے ہم وطن نہیں جانتے کہ روشنی کدھر سے آ رہی ہے۔ وہ صرف اس قدر جانتے ہیں کہ جدھر وہ ہیں، اُدھر گھپ
ہے۔ مایوسی ہے۔ آنے والے ضرور سوال کریں گے پلیز انہیں جواب دینے کے لیے، ان کی رہبری کے لیے
ڈاکٹر صاحب۔ انہیں مایوس نہ کرنا۔ مایوسی سے بچانا ڈاکٹر صاحب!''

شمس اور ڈاکٹر صاحب کی آنکھیں بغلگیر ہو کر عہد و پیمان کرنے لگیں۔ عفت نے جو نوالہ اٹھا رکھا تھا
پیالے میں ڈال دیا۔ خاں صاحب نے بڑی میٹھی مسکراہٹ کے ساتھ پیالے میں نظریں گاڑ دیں۔ گویا شمس
صاحب کے لیگل کاغذوں پر گواہ بن کر دستخط کر رہے ہوں۔

اس وقت تہہ خانے کا دروازہ کھول کر ایک بھاری بھرکم سفید فام بڑا ہی تنومند آدمی داخل ہوا۔ اس کی
فلمی ولن جیسی، جسم پر دوشالا، رئیس ابن رئیس جیسے ہاتھ پاؤں خود اعتمادی میں بھیگی ہوئی آواز میں گھڑیال سی گرج
گلے میں ایک بڑا سا گیندے کا ہار پہن رکھا تھا، جس کے پھول نوچ نوچ کر وہ اِدھر اُدھر پھینک رہا تھا۔

''فراڈ ہے بابا...... چکر ہے...... جان چھپا رکھا ہے بابے نے...... بادام روغن کی بوتلیں بیچی جا رہی
معجونیں گھوٹ گھوٹ کر بگڑا رہا ہے سب کو...... آلو شوربے کھلا کھلا کر تباہ کر دی خلق خدا...... لُچے بدمعاش...... پوتی
کو...... جہالت سکھا دی سب کو، پاکھنڈی ہے بابا...... بیٹا خلق خدا کا فائدہ کرو...... خلوت جلوت ایک کرو......
جلوت کیا ہوتی ہے؟...... کیا ہوتی ہے خلوت جلوت؟ خلوت جلوت...... خلوت جلوت۔''

اس نے دھمال ڈالنے والوں کی طرح خلوت جلوت کی تھاپ پر ناچنا شروع کر دیا۔ پھر یکدم ایک
لپٹ کر وہ زار زار رونے لگا۔

عفت خوفزدہ ہو کر بولی۔ ''گھر نہ چلیں اشفاق بھائی۔ مجھے...... میری طبیعت ٹھیک نہیں۔''

ہم تینوں خاموشی سے اٹھ آئے۔ نہ کسی نے ہمیں روکا نہ کسی قسم کا اصرار کیا۔

اشفاق صاحب کے ہاتھ میں بادام روغن کی بوتل اور معجون تھی جسے وہ بڑی احتیاط سے اٹھائے ہم
آگے چل رہے تھے۔

نوارد نے ڈیرے کا تمسخر اڑا کر ایک بار پھر عفت کے ارادے کو متزلزل کر دیا۔ اس کے چہرے سے
روشنی کم ہو گئی۔ شک اور گمان نے چھاپہ مار کر اسے جھنجھوڑ دیا۔ واپسی پر خاں صاحب اوپر اپنے خلوت خانے یعنی
میں چلے گئے۔ ابھی ''تلقین شاہ'' کا سٹوڈیو انیس خاں کی تحویل میں تھا۔ وہی اس کی ریکارڈنگ کرتا، اس کا حساب
رکھتا اور تلقین شاہ کی ریکارڈنگ کے دوران ''کٹ اِٹ'' مؤدب زبان میں بولتا اور ساتھ ساتھ ایم بی اے کی
کرتا۔

سٹوڈیو سے ملحق ریکارڈنگ روم، غسل خانہ اور اس کے بعد اوپر چڑھنے والی گول (Spiral) سیڑھیاں
منزل کا حصہ تھیں۔ یہیں سے خاں صاحب کی باہر والی لائبریری شروع ہو جاتی تھی۔ تینوں طرف الماریاں اور ایک
ٹیرس پر کھلنے والی کھڑکی اور دروازہ تھا۔ اس لینڈنگ پر وہ میز بھی دھری تھی جس پر بیٹھ کر خاں صاحب سوچتے، لکھتے
پڑھنے میں مشغول ہو جاتے۔

اسی لائبریری میں ایک الماری تھی جو سسک خانے سے لگتی دیوار میں جڑی تھی۔ اس میں چپ بورڈ کے تختے تھے
ی میں ان کا مالِ غنیمت، لوگوں کے عقیدت سے بھیجے تحفے، خاں صاحب کی دل رکھنے کے ضمن میں کی ہوئی
ی تھیں۔ لندن، امریکہ سے لائے گئے پن، بال پوائنٹ، مارکر، ہائی لائٹر، ربڑ، سیاہی مٹانے والے آلے،
ڈائریاں، نوٹ بکس، ان پر لکھے ہوئے نوٹس، کافی کے ڈبے، جن سنگ اور قسماقسم کے قہوے، لنز، چابیاں،
نے والے چھوٹے بڑے تالے، ہر سائز قماش کی قینچی، گھڑیاں، ہیلتھ چینز، نیل کٹر، فائلیں...... یہاں ایک کائنات

ان تمام چیزوں کو زیرِ استعمال لانے کا خاں صاحب کو شوق نہ تھا۔ یہ تو ایک Memory Box تھا۔ جب وہ
یک پن اُٹھا کر ایک گھڑی دیکھ کر کسی واقعہ، شخص، وقت کو حاضر کر لیتے۔ وقت اور مقام میں یوں آسانی سے سفر کرنا
لیے آسان ہو جاتا۔ اس بازیچۂ اطفال سے گزر کر وہ اپنی کتابوں میں گم ہو جاتے۔

ان کتابوں کا سلسلہ کسی محبوبہ کی داستان تھی۔ کچھ کتابیں ان کے ساتھ مکتسر سے آئی تھیں۔ کچھ 1۔ مزنگ روڈ
ہو گئی تھیں۔ وہ کسی شکاری کتے کی طرح سونگھ کر کتاب تلاش کر لیتے۔ امریکہ، اطالیہ، لندن سے کتابوں کے
لے آتے۔ انارکلی کے فٹ پاتھیے، ان کے یار تھے۔ جونہی ہم دونوں کسی کسی اتوار کو انارکلی میں داخل ہوتے۔
ڈیپارٹمنٹ سے ملحق دیوار کے آگے فٹ پاتھ پر کتابیں پھیلائے کباڑیئے ہمیں لبیک کہتے۔ انارکلی کے دہانے پر
یں پرانی کتابیں سرِ عام منتظر ہوتیں۔ خاں صاحب چنتے رہتے۔ وہ کتابوں کو ٹھوکتے رہتے۔ مطلب کی سیکنڈ ہینڈ
ڈھیر لگ جاتا۔ وہ ہر کباڑی کے ساتھ عورتوں کے انداز میں بھاؤ تاؤ کرتے۔ یہ ان کا کباڑیئے کے ساتھ
قائم کرنے کا طریقہ تھا۔ کار پارکنگ کرنے والوں سے ضرور پوچھتے کہ کار کا کرایہ کس قدر ہے اور یہ ریٹ
ہوا ہے یا کم...... یہ بھی دوسرے کو گفتگو میں گھسیٹنے کا سربندھ تھا۔

یوں کباڑیئے کے ساتھ بحث مباحثے کے بعد بغیر گنے اسے پیسے دے دیتے اور واپسی پر جو کچھ بچ رہتا کسی
فٹ پاتھ پر ڈھیر فقیر کے سرہانے رکھ کر گھر لوٹ آتے۔ جتنی دیر خاں صاحب اور کباڑیوں میں نوک جھونک،
ب ہوتا میں کوئی ایک کتاب اٹھا کر فٹ پاتھ کنارے بیٹھ جاتی اور اچھی خاصی کتاب پڑھ لیتی۔ رفتہ رفتہ مجھے دیکھ
کتابوں کے مالک مجھے کوئی کرسی لا دیا کرتے۔ میں سہولت سے پڑھتی رہتی۔ خاں صاحب پتنگ پاتنگ کی بازی
ں کا کھیل کھیلتے رہتے۔

واپسی پر ان کتابوں کی چھان پھٹک ہوتی۔ وہ ان پر چڑھانے کے لیے سیمنٹ کے خالی براؤن کاغذ سے بنے
تھیلے ...تے۔ یہ تھیلے عموماً میو ہسپتال کے سامنے والے کباڑیوں سے حاصل کیے جاتے۔ گھر لا کر انہیں وزن تلے رکھ
یا جاتا۔ کچھ دنوں بعد کھول کر کاغذ سیدھا کر کے انہیں کتابوں پر چڑھایا جاتا۔ کتابوں کی پشت پر موٹے مارکر
اسے بڑے سلیقے اور ترتیب سے سجایا جاتا۔

یہ سارا Ritual خاں صاحب کے لیے کسی تہوار کی طرح دلچسپ تھا۔ انہوں نے کتابوں کو انسانوں کا روپ
دے رکھا تھا۔ ہر کتاب کو خاکی لباس پہنا کر وہ اسے اپنی الماریوں کی رجمنٹ میں رکروٹ کر لیتے۔ ایک بار جب امجد

اسلام امجد اور فردوس ہمارے گھر آئے تو امجد نے کہا۔

''خاں صاحب..... یہ کتابوں کو کاغذ کون چڑھاتا ہے؟''

''میں اور کون؟''

''اور ان کے پشتے پر کون نام لکھتا ہے کتاب کا؟''

''بھائی میں..... اور کون؟''

امجد ابھی حیران ہونے میں مشغول تھا کہ فردوس بولی۔''اور امجد آپ نے اپنی کتابیں گیراج میں یوں رکھی ہیں جیسے عید کے دن اوجڑیاں پڑی ہوتی ہیں سڑکوں پر۔''

بیچاری فردوس کو علم نہ تھا کہ خاں صاحب ہر کام کا پراجیکٹ بنا لیتے ہیں۔ اسے مرغی کے انڈے کی طرح ہیں اور جب اس میں سے چوزہ نکلتا ہے..... یا دو کا ہلکا زرد چوزہ..... تو پھر خاں صاحب کو عجیب سی خوشی ہوتی ہے خواہشات کو تج کرنے والے بھکشو کو اپنے کاسے میں پڑے باسی کھانے کو دیکھ کر ہوتی ہے۔ خواہشات کو فی الفور میں جو آنند تھا۔ اس علم کو خاں صاحب سے زیادہ کوئی نہیں جانتا۔ وہ گھر آ کر کتابیں پڑھنا شروع نہیں کرتے خواہش پر انتواء کا ڈھکنا لگاتے۔ کتاب کی عزت افزائی میں مشغول رہ کر اسے ایک تہوار میں بدل کر وہ اپنی تربیت رہتے تھے۔ کتابوں سے نکل کر خاں صاحب کو عفت کی فکر سمیٹ لیتی۔

لیکن بابا جی کا تمسخر اڑانے والا عفت کو ایک بار پھر متزلزل کر گیا تھا۔

گھر پہنچ کر خاں صاحب نے عفت کے تذبذب کو بھانپ لیا لیکن وہ اسے کسی نتیجے پر جبراً پہنچانا نہیں تھے۔ گھر کا بڑا پھاٹک نما دروازہ کھول کر اندر داخل ہو کر خاں صاحب Spiral سیڑھیوں پر گول گول چڑھتے میں چلے گئے۔ میں عفت کے لیے انار کا رس نکالنے باورچی خانے میں پہنچ گئی۔ عفت کا سنی مہمان خانے میں تھوڑی دیر کے بعد میں اُس کے لیے دیسی اناروں کا رس نکال کر کمرے میں گئی تو وہ پلنگ پر نیم دراز کشور سے باتیں تھی۔

''ہاں ہاں..... بابا ہاں۔''

اُدھر سے کشور نے غالباً کہا..... ''کہاں تھیں تم۔ میں نے تمہیں تین فون کیے ہیں۔''

''میں نے کہاں جانا ہے۔ بابا جی کے علاوہ اور کہاں؟''

''ایک ڈاکٹر ہو کر تم کس جہالت میں پڑی ہو عفت؟'' کشور بولی۔

''وہ بڑی اچھی جگہ ہے۔ وہاں رنگ رنگ کے آدمی ہیں۔ مجھ جیسے جسمانی مریض، کچھ ذہنی مریض گزار، اڑب، چور، غنڈے، اُچکے۔''

''میں حیران ہوں لندن، ہالینڈ، فرانس کے بعد تمہیں یہی جگہ سوجھی ہے۔''

''بابا جی کہا کرتے ہیں چونکہ اب جہالت انتہا کو پہنچ گئی ہے، اس لیے رحمت بھی انتہائی جوش پر آ گئی ہے۔''

''آخر یہ بابا ہے کون؟'' کشور نے سوال کیا۔

''سیدھے سے بزرگ ہیں۔ اُن کے مرید باباجی کو نوے سال کا بتاتے ہیں۔ بڑے خوبصورت، گورے چٹے،
ن ہے۔ کہتے ہیں اُمی ہیں۔ مستی پہرہ گزار چکے ہیں۔'' عفت بولی۔

''مستی پہرہ؟ وہ کیا ہوتا ہے؟'' کشور نے پوچھا۔

''جنگلوں میں نکل جاتے تھے۔ جانوروں سے باتیں کرتے تھے۔ بس درختوں سے پھل توڑ کر کھا لیتے۔ کیفیت رہی۔ پورے چودہ برس پھر بزرگانِ دین میں سے ایک سائیں خدا بخش کے حضور پہنچ گئے۔ برسوں ت کی۔ تعلیم لیتے گئے اور پھرتے پھراتے اب اختری روڈ پر ڈیرہ ہے۔ کہتے ہیں..... ایک لفظ پڑھنا نہیں آتا۔ سے زائد ایک لفظ نہیں بولتے۔''

''لے یہ کیوں؟''

''کیوں اس لیے کہ فرماتے ہیں مناظرہ ہمیشہ شوکتِ نفس کے لیے ہوتا ہے۔''

''کیا پکھی پنچھی باتیں سیکھ آئی ہے ڈیرے سے ..... ہسپتال گئی تھی؟'' عفت کی چھوٹی بہن کشور نے کہا۔

''رس پی لو عفت، باباجی نے فرمایا تھا۔''

''یہ تو کھٹا ہوگا، اس کا گلا پکڑا جائے گا قدسیہ، انار کا رس مت پلاؤ۔'' کشور نے مجھ سے کہا۔

''نہیں دیسی اناروں کا رس ہے، کھٹا نہیں ہے۔''

عفت کو رس کا پینا اچھا تو نہ لگا لیکن وہ چپ رہی..... ''ہسپتال گئی تھیں؟ بول۔''

''نہیں۔''

''بلڈ ٹسٹ کروایا تھا؟''

''نہیں۔''

''ایکس رے؟''

عفت نے نفی میں سر دائیں بائیں ہلا دیا۔

''یورن ٹیسٹ؟''

''اوئے بابا نہیں نہیں نہیں۔'' عفت نے چڑ کر کشور سے کہا۔

''شہاب بھائی کو فون کرتی ہو۔ وہ بات کریں گے تیری اس نہیں نہیں نہیں کی۔''

عفت مسکرائی اور بولی..... ''وہ فون کرتے رہتے ہیں۔''

''لندن کب جاؤ گی چیک اپ کے لیے؟''

''شاید کبھی نہیں۔''

''لیکن یہ تو خطرناک ہے عفت۔ شہاب بھائی منع نہیں کرتے؟''

''انہوں نے قدسیہ کو منع کیا ہے۔ مجھے تو کچھ نہیں..... میں جو مرضی کروں۔''

''کیا منع کیا تھا قدسیہ؟'' مجھ سے کشور نے پوچھا۔

''شہاب صاحب نے مجھے منع کیا تھا کہ میں بابا جی کی بیعت نہ کروں۔ یہ زمانہ بیعت کا نہیں ہے۔''

''یہ قدسیہ بڑی وہمی ہے۔ بابا جی بیعت تھوڑی کرتے ہیں۔ وہ تو وضو کراتے ہیں۔ پاک کرتے ہیں۔ جب انہوں نے مجھے وضو کرانا تھا، یہ وہاں گئی ہی نہیں کھوتے کا سر...... بڑی جاہل ہے۔'' عفت بولی۔

''لیکن بیعت کیوں نہیں کرنی قدسیہ...... کیا وجہ؟'' کشور بہت پریشان تھی۔

میں نے جھٹ سے جواب دیا ''شہاب بھائی کہتے ہیں بیعت کے کچھ آداب ہوتے ہیں۔ اگر ماننے کا عہد کر لے تو پھر شیخ کی حکم عدولی نہیں کر سکتا۔ اگر بابا جی نے تینوں سیدت ڈیرے پر رکھ لیے تو کیا میں کر لوں گی۔''

''اوئیں...... بابا جی کیوں ایسا کریں گے؟'' عفت نے کہا۔

''اگر بابا جی ثاقب کا بیاہ کسی اندھی لڑکی سے کر دیں تو مان جاؤ گی عفت؟'' کشور نے سوال کیا۔ ''ہیں شہاب بھائی۔ اب اتنا پڑھ لکھ کر تو آدمی بیعت شیٹ نہیں کر سکتا۔'' کشور نے بیعت کا ٹاپک بند کر دیا۔

ہم دیر تک باتیں کرتی رہیں۔ کمرے میں دھندلکا چھا گیا تو عفت نے وہ بیڈ لیمپ روشن کر دیا جس کا بلب روشن تھا۔ زیرو کے بلب میں یہ خاصیت ہوا کرتی ہے کہ وہ دوسرے بلبوں کے مقابلے میں تو بے حیثیت عطا کرتا ہے لیکن اگر آدھی رات کو اندھیرے میں روشن ہو تو اس کی نربل روشنی میں ہر چیز کی جسامت، ساخت بڑی ہو جاتی ہے۔

عفت کی چھوٹی بہن کشور بڑی مایوس ہو گئی تھی۔ عفت تازہ مغرب پلٹ تھی۔ میرے خیال میں ـــ سے مانوس کرنے والے ان پڑھ جاہل نالائق پیر وکار نہ تھے۔ یہاں بھی ڈاکٹر صاحب اور شمس کی روشن باتوں ـــ حصار میں لے لیا تھا۔ یہاں بھی مغربی چمک، سچائی، روشن خیالی ہی کام آئی۔ مغرب نے ہی عفت کو مشرق سے روشناس کرایا۔

چند دنوں کے بعد عفت اور میں ڈیرے پر پہنچیں تو بابا جی ڈیرے پر موجود نہ تھے۔ ہم باہر ہی بیٹھ گئیں۔ علی محمد صاحب حسب معمول کھانا تیار کر رہے تھے۔ بابا جلال نے پہنچتے ہی لال چائے کے کٹورے دھر دیے۔

''ابھی بابا جی آ جائیں گے۔ آپ چائے پئیں۔''

اس وقت شمس کہیں سے آ گیا اور بے تکلفی سے ہمارے پاس بیٹھ گیا۔ میں نے دل میں سوچا، یہ بھی مرحلہ ہے کہ بابا جی جیسے بزرگ کو شہرت سفید فام شمس سے مل رہی ہے۔ ان پر ایمان کو مضبوطی بخشنے والا مغربی تھا۔ میں باتیں سوچنے کی عادی تھی۔

گھر پہنچ کر عفت سے اشفاق صاحب نے پوچھا۔ ''طبیعت کیسی ہے عفت؟''

''ٹھیک ہے اشفاق بھائی۔''

''انار کا رس پیا تھا؟''

"جی۔"

"قدسیہ کو یاد دلاتی رہنا۔ دن میں کم از کم تین بار..... دیسی انار..... قندھاری نہیں۔ اس کے کئی اور بکھیڑے ہیں نہ جائے۔"

"نہیں جی یہ بھولتی نہیں۔"

"عرق..... معجون؟"

"جاری ہے، آپ فکر نہ کریں۔"

"عفت میں سوچ رہا تھا....."

وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گئے۔

"میں سوچتا رہتا ہوں کہ تمہیں ڈیرے پر لے جانا تو چاہیے تھا لیکن وہاں کے علاج کے سپرد کرنا زیادتی نہ ہو جائے۔ ناں اس طرح کے علاج میں بڑا Risk ہے۔"

"ہونے دیں..... مجھے رسک پسند ہے۔"

"بڑی خطا ہو جانے کا احتمال ہے۔" خان صاحب بولے۔

"آپ نے سنا نہیں تھا اشفاق بھائی۔ بابا جی فرماتے تھے جہاں خطا ہے، وہیں عطا ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے پھر بھی..... اگر تمہیں کچھ ہو گیا تو شہاب مجھے کیا کہے گا۔"

عفت کھڑی رہی۔ اس کی مزاح کی حس اس وقت ماند پڑ گئی تھی۔ نہ اس نے "اے ہے" کہا نہ مسکرائی۔ خاں صاحب کرتائی جوتے اتارنے میں مشغول ہو گئے۔ کچھ عرصہ پہلے خاں صاحب کا دل کسی سرہنگ زادے کا دل تھا۔ دل کر لیتے تھے۔ نیا تجربہ ان کے توسنِ تخیل کو بھاگنے پر مجبور کرتا۔ مشکل سے مشکل امتحان میں بھی کبھی ان کا پٹھا

وہ ہر بڑے امتحان میں خم ٹھونک کر زندگی کو مات دینے کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ خاں صاحب کے والد بابا محمد خاں فوت ہوئے تو میت گھر پر تھی۔ لوگوں کا انتظار ہو رہا تھا اور اسی کمرے میں بیٹھے خاں صاحب من شاہ لکھ رہے تھے کیونکہ دوسرے دن ریکارڈنگ تھی اور وہ کبھی ذمہ داری سے بھاگنے والے نہ تھے۔

وہ غالباً اس احساسِ جرم میں مبتلا تھے کہ عفت کو بابا جی کے حوالے کر کے وہ کہیں کوئی بڑی غلطی تو نہیں کر رہے۔ ان کی دانش پر کلی ایمان تھا۔ وہ اس خطے کی موروثی Wisdom کے دل سے قائل تھے لیکن مغربی تعلیم اور سائنس کے تجربات بھی ان کے سامنے تھے۔ وہ ہر روز سائنسی کتابوں کی ورق گردانی اور ان کے ترجموں کی رسائی میں وقت صرف کرتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ ان کی خاموشی کی اصل وجہ یہی تضاد تھا۔ میں نے کبھی سوال تو نہ کیا لیکن اندر ہی اندر خوفزدہ وہ تھے کہ کہیں عفت کا علاج غلط تو نہیں ہو رہا۔ کہیں اس طرف کا چسکا لگا کر میں شہاب سے زیادتی کا تو نہیں ہو رہا۔

راتیں سرد ہو چکی تھیں۔ عفت کے لیے یہ سردی قیامت کی تھی۔ اس کا جسم خاطر خواہ حد تک لہو بنانے سے قاصر

تھا۔ وہ سارا دن ہیٹر چلائے کمرے میں بند رہتی۔ جب دھوپ تیز ہو جاتی تو لان میں جا بیٹھتی۔ بچوں کی واپسی کے ہمارے کمرے سے ملحق بچوں کے کمرے میں چلی جاتی۔ بچے اپنی سکھی سہیلی عفت سے باتیں کرتے۔ کیمسٹری سکول کی باتیں سناتے اور ان کے سونے پر عفت پھر کاسنی کمرے میں چلی جاتی۔

ایک روز خاں صاحب ہمارے ساتھ ڈیرے نہ جا سکے۔ پتہ نہیں ان کے اندر کے احساسِ جرم نے یہ ڈالی کہ دفتری کاموں کا الجھاؤ تھا۔ بہرکیف ہم دونوں ڈرائیور کے ساتھ اکیلی ہی ڈیرہ پاک پہنچیں۔ راستے طرح میں نے اسے سمجھانے کے سلسلے میں سعی شروع کر دی۔

''عفت تھوڑی سی عقل کرو، جرمنی چلی جاؤ..... پلیز۔''

عفت نے سر جھکا کر کہا۔ ''ساری بات Faith کی ہے قدسیہ۔''

''چلو یہ دل لگی بھی جاری رکھو لیکن Dialysis سے غفلت نہ برتو۔''

اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی سے اپنی صحت کے متعلق بات نہیں کرنا چاہتی شاید مرنے کا خوف نہیں تھا لیکن شہاب بھائی کا فکر تھا۔ ہو سکتا ہے چھوٹے ثاقب کے متعلق کچھ اندیشے ہوں لیکن چہرے پر وسوسے، سوچیں، امید نا امیدی عیاں ہو رہی تھی۔

یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اپنی ضعیف الاعتقادی پر پچھتا رہی ہو لیکن ڈوبنے سے پہلے تنکے کا سہارا بھی حیران کن تھا۔ ڈیرے کے متنوع لوگ، بابا جلال، ڈاکٹر اشرف فاضلی، شمس اور ان سب میں ''جلوت خلوت بھاری بھرکم شخص۔

''عفت سوچ لو۔ سوچ لو، آخری بار یہ سودا مہنگا نہ پڑے۔''

عفت نے التماس کے درخت کے پاس پہنچتے ہوئے جواب دیا۔ ''ضرور یہ کم عقلی ہے، جہالت ہے۔ اپنی مرضی کی موت کیوں مرنے نہیں دیتیں۔ تم چاہتی ہو میں ٹیکوں سے چھلنی کسی سرجری کی میز پر لہولہان ہوئی مر جاؤں۔ میرا سانس کسی آکسیجن ٹینٹ میں گھٹ کے بند ہو جائے۔ تم لوگ نہیں چاہتے کہ جب حوریں لینے آئیں۔ نہروں اور باغوں میں میرا ٹھکانہ ہو!''

اس کے بعد میں نے کچھ نہ کہا۔

ہمیشہ کی طرح بابا جلال ہمیں تہہ خانے میں لے گیا۔

عجب اتفاق تھا کہ اس روز تہہ خانے میں کوئی موجود نہ تھا۔ بابا جلال چائے لے کر آ گئے۔ ہم تھیں۔ تھوڑی دیر کے بعد بابا جی ہاتھ میں بادام روغن کی بوتل لے آ گئے۔

''لو جی بڑی خیر ہو گئی پُت..... آج تو ہم نے خود بادام روغن نکالا ہے صاف ستھرا۔''

بابا جی ابھی بیٹھے بھی نہ تھے کہ عفت بولی۔ ''بابا جی! سارے لوگ مجھے اس علاج سے مایوس کر رہے کروں؟''

''ناں ناں پُت۔ مسلمان کو مایوس ہونے کا حکم نہیں۔ شیطان کا اور کیا کام ہے پُت۔ وہ

بن جاتا ہے۔ آدمی کا معجزے پر اعتماد ختم کرتا ہے۔ ناں ناں پت مایوسی گناہ ہے گناہ۔“

”پر بابا جی۔“

”پر..... ور کوئی نہیں پت۔ اوپر والے پر کھلی ایمان رکھو۔ جن کا ایمان مضبوط ہوتا ہے ان کے لیے تے ان کے لیے معجزے ہوتے ہیں۔“

یکدم انہوں نے تہہ خانے میں نظر دوڑائی۔ پھر حیران ہو کر بولے۔”اشفاق صاحب ہمارے جانی جان نہیں۔“

”خاں صاحب تو آج نہیں آ سکے بابا جی۔“

بابا جی اٹھ کھڑے ہوئے۔”ناں بیٹا ناں محرم کے بغیر نہیں نہیں آنا جانا۔ حج اور عمرے پر بھی نہیں۔ جہاں محرم نہ ہو وہاں شیطان تیسرا فریق بن بیٹھ جاتا ہے۔ پھر خطرہ تو ہر وقت موجود ہوتا ہے۔ شاباش پت۔ واپس جاؤ۔ محرم کو لے آؤ..... نہ آ سکے تو پھر سہی۔ شاباش پت۔“

ہم آزادی پسند پُر اعتماد اپنے راستے اور فیصلے خود کرنے والی عورتیں تھیں۔ اس بات سے ہم دونوں کو ٹھیس سی لگی۔

جب ہم گھر پہنچے تو عفت کی بڑی بہن جمیلہ اور کشور کو اپنے انتظار میں پایا۔ وہ تینوں لان میں کرسیاں ڈالے چپ چاپ سے انداز میں بیٹھے تھے۔ لان ہی میں ایک چارپائی بچھی تھی جس پر عفت کا بستر لگا تھا۔ ہم نے سرد مہری سے ایک دوسرے کا استقبال کیا۔ عفت چپ چاپ بستر پر نیم دراز ہو گئی۔ شہاب صاحب کے بھانجے اقبال شہاب کا چہرہ ایسے لگتا تھا جیسے آپ کو اس بیماری کا ذمہ دار سمجھتا ہو۔

”پتہ نہیں ماموں جان کو کیا ہو گیا ہے؟“ اقبال شہاب یہ کہہ کر چپ ہو گئے۔

”کیا ہو گیا ہے شہاب کو؟“ عفت ابرو اٹھا کر بولی۔

”میں خط لکھتا ہوں۔ جواب نہیں دیتے۔ ثریا فون پر بات کرنا چاہتی ہے۔ وہ آئیں بائیں شائیں کرتے ہیں۔ علاوہ تمہیں جرمنی لے کر کیوں نہیں جاتے۔ مجھے معلوم ہے وہاں تمہاری بیماری کا پکا پکا علاج ہے۔“

”پھر؟“

”وہ خود تو فیصلہ نہیں کرتے اور ہم سب کو مفت میں پریشان کر رکھا ہے۔ آخر ہمارا بھی تو تم پر حق ہے۔ خود تو مزے سے اسلام آباد میں بیٹھے ہیں۔ کشور نے مجھے بتایا ہے کہ یہاں کوئی بڈھا (Quack) تمہارا علاج بالغذا کر رہا ہے اور وہ ان پڑھ ہے بابا بیچارہ۔“

عفت نے ہمت سے جواب دیا..... ”نبی بھی ان پڑھ تھے اقبال۔ کسی نبی کے پاس پی ایچ۔ڈی کی ڈگری نہ تھی لیکن ہمارے پڑھے لکھے لوگوں سے افضل تھے۔ کیا حضرت ابراہیمؑ، کیا حضرت موسیٰؑ، کیا حضرت عیسیٰؑ۔“

کشور اس وقت اقبال کی کمک کو پہنچی۔

”پلیز عفت understand۔ میں Faith-healing کے خلاف نہیں ہوں لیکن اس وقت تمہاری حالت ایسی نہیں کہ اتنا بڑا Risk لیا جا سکے۔ ہم تمہارے ساتھ بحث کرنے نہیں آئے عفت پلیز..... پلیز پلیز۔“

عفت نے کسی کی بات کا جواب نہ دیا اور پیٹھ موڑ کر لیٹی رہی۔ وہ تینوں چپ چاپ چلے گئے۔ اتنی بات ہوئی کہ دوسرے دن اچانک شہاب بھائی آ گئے۔ میرا خیال ہے انہیں اقبال شہاب نے فون کیا ہوگا۔

جب سے عفت ہمارے پاس تھی شہاب بھائی کم کم اسلام آباد سے آتے۔ کبھی کبھی ثاقب ان کے ساتھ ان دنوں ثاقب کے ساتھ مل کر رات کو بچے بڑا اودھم مچاتے۔ سب مل جل کر کھانے پکاتے۔ سب اپنی اپنی ترکیبیں اور ہیڈ کک انیق میاں سب کی مان لیتا۔ اس ہیڈ باورچی کی ماننے کی خصلت کے باعث کبھی لڑائی کی نوبت نہ آئی تک عفت کی بیماری، ڈیرہ پاک کا علاج، ہم سب بڑوں کے وسوسے کبھی ٹرانسمٹ نہ ہوئے۔ وہ رات کو سائیکلوں نکل جاتے۔ نہ ہمارے کالے پھاٹک کو کبھی تالا نصیب ہوا۔ نہ ماڈل ٹاؤن کے گھروں ہی میں ابھی دروازے پھاٹک کرنے کا رواج تھا۔

شہاب بھائی جب بھی ہمارے پاس آتے وہ بہت کم ہمارے ساتھ ڈیرہ پاک جاتے۔ انہوں نے اس فیصلے کی آزادی دے رکھی تھی لیکن اس بار جب وہ آئے تو ان کے چہرے پر تشویش تھی۔ ہم نے ایسی فکرمند ان کے چہرے پر نہ دیکھی تھی۔ عفت ڈیرے پر جانے کی تیاری کر رہی تھی۔ ہمارے دروازے پر دستک ہوئی نے دروازہ کھولا۔

''کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟'' اتنے برسوں بعد بھی وہ عام لوگوں کی طرح ہم سے بے تکلف نہ ہوئے تھے

''آئیے آئیے۔'' میں نے خوش دلی کے ساتھ خوش آمدید کہا۔ خاں صاحب کتاب چھوڑ کر ان کے بنچ پر آ بیٹھے۔

''تم سے ایک بات کرنا تھی اشفاق۔''

خاں صاحب مکمل توجہ تھے..... ''فرمائیے، حکم دیجیے۔''

''انسان میں توازن سب سے بڑی خوبی ہے۔ یہ باقی رہے تو انصاف قائم رہتا ہے۔ انسان گھڑی کی طرح کبھی اِدھر کبھی اُدھر نہیں ہوتا۔ بہرحال تم خود دینی کتب کا مطالعہ کرتے رہتے ہو..... مجھے..... عفت کے لیے تو اتنا اندیشہ نہیں ہے لیکن ڈیرہ پاک اور ہسپتالی علاج کے درمیان پنڈولم کی طرح چکر لگاتے لگاتے وہ الجھ گئی ہے ڈر ہے کہ کہیں ڈیرے پاک پر اس قدر اندھے اعتقاد کے باعث اس کی عاقبت برباد نہ ہو جائے۔''

ہم دونوں مجرموں کی طرح سر جھکائے بیٹھے تھے۔

''تم جانتے ہو شرک اسلام میں سب سے بڑا گناہ ہے۔ خدا کی ذات کے ساتھ کسی کو شریک کرنا بہت گستاخی ہے۔ اگر عفت یہ سمجھ رہی ہے کہ کوئی آدمی وہ کچھ کر سکتا ہے جو خدا نہیں چاہتا تو اس کی بڑی بھول ہے۔''

میں عفت کی طرفداری میں بولی۔ ''لیکن وہ اپنے پاک بندوں کی سُن تو سکتا ہے۔ عفت بھی ڈیرے پر برکت کے لیے جاتی ہے۔ باباجی کی دعا پر اسے بھروسہ ہے۔''

''یہاں ہی قدسیہ تھوڑی سی غلطی ہو جاتی ہے۔ کسی شخص کو جب یہ گمان ہو جاتا ہے کہ وہ پاک ہے تو خدشہ کہیں وہ غلط فہمی کا شکار نہ ہو..... نیکی کا راستہ بھی پیدل سفر کا راستہ ہے۔ آدمی چلتا رہے، چلتا رہے..... اور بس۔''

"جی وہاں خطرہ تو ہر وقت موجود ہوتا ہے۔ بابا جی بھی یہی فرماتے ہیں۔" میں نے جھٹ علمیت بگھارنے کی

"اگر وہ یہ کہتے ہیں تو ٹھیک ہے لیکن مجھے ڈر ہے کہ کہیں عفت ان سے کسی معجزے کی توقع نہ لگا بیٹھے۔ دل حد تک تو ٹھیک ہے لیکن......"

وہ چپ اٹھ کر چلے گئے۔

ہم تینوں ڈیرے پاک جانے کے لیے تیار ہوئے تو شہاب بھائی باہر نکلے اور ہمارے ساتھ ہو لیے۔ کچھ کہے کھولا...... اور بیٹھتے ہوئے کہا۔ "کیا اجازت ہے اشفاق؟"

سارا راستہ خاموشی رہی۔ ہم نے گاڑی باہر پارک کی اور اندر کی طرف چلے۔ اللہ کی وحدت کثرت میں بٹی میں پھیلی تھی۔ کچھ لوگ چھپکلی کی کٹی ہوئی دم کی طرح تڑپ رہے تھے، کچھ راضی برضا ہونے کی کوشش میں اکائی صورت بیٹھے تھے۔ کچھ مجسم سوال اور کچھ مکمل جواب صورت تھے۔ ہم بابا جی کے پاس لنگر والی جگہ جا بیٹھے۔ معمول دیگچے چڑھے تھے۔ علی محمد صاحب ان میں مصروف تھے۔ بابا جی روغنی پیالوں میں لنگر بانٹ رہے تھے۔

گڑ والی چائے کا دور چل رہا تھا۔

"آ گئے ہمارے جانی جان...... چلو پتر نیچے چلو۔"

"آج نہیں بابا جی۔ آج ہمیں جلدی واپس جانا ہے۔ شہاب نے اسلام آباد واپس جانا ہے۔"

بابا جی چپ ہو گئے۔ ہمیں چائے کے کٹورے تازہ دم کرنے کے لیے دے دیے۔

شہاب بھائی نہ ڈیرہ پاک دیکھ رہے تھے نہ ان کی توجہ بابا جی پر تھی۔ وہ بار بار چور نظروں سے عفت کی طرف رہے تھے۔ عفت بار بار جھوک کھا جاتی اور پھر قوت ارادی کے بل بوتے پر اپنے آپ کو متوجہ کرتی۔ شہاب صاحب کسی طور ہنس کر اس کے راز معلوم کرنے والے نہ تھے۔ پورے تین سال لندن میں رہ کر عفت کے ساتھ ہسپتالوں کی یاتری میں انہوں نے کچھ ایسے سبق سیکھ لیے جن کا ذکر ان کی تحریر میں تھا نہ لبوں پر۔

کچھ دیر کے بعد خود ہی عفت اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اچھا بابا جی اجازت دیں۔"

اتنی لاتعلقی سے ہم کبھی ڈیرہ پاک نہ گئے تھے۔

پتہ نہیں عفت نے شہاب بھائی کی تشویش بھانپ لی تھی یا اسے ثاقب کی کچھ فکر تھی۔ ہو سکتا ہے وہ اقبال شہاب، اور جمیلہ کی وجہ سے گڑبڑا گئی ہو۔ وجہ جو بھی تھی ہمیں معلوم نہ ہوئی۔ اس بار شہاب بھائی نے کاسنی کمرہ چھوڑا تو عفت ساتھ چلی گئی۔

اس کے بعد ہمیں اس وقت پتہ چلا جب اقبال شہاب نے انہیں میو ہسپتال میں داخل کروا دیا۔ کچھ ماہ بعد جب بھائی ہمارے گھر آئے۔ میں نے عفت کے متعلق کچھ نہ پوچھا۔ پتہ نہیں کیا حجاب تھا۔

"عفت منہ سے تو کچھ نہیں کہتی...... لیکن مجھے لگتا ہے وہ تمہیں یاد کرتی ہے۔"

''میں آؤں گی اسلام آباد اس سے ملنے۔''

''نہیں۔ وہ اسلام آباد میں نہیں ہے۔''

''پھر کہاں ہے جی؟''

''یہاں لاہور..... میو ہسپتال میں۔''

''تو اس کے پاس ہسپتال میں کون ہے شہاب بھائی؟''

''فوزیہ ہے۔''

''آپ مجھے کہتے شہاب بھائی میں اس کے پاس رہ لیتی۔''

میں نے اشفاق کی طرف دیکھا۔ پتہ نہیں انہیں کیا چیز ستا رہی تھی۔

مجھے یاد آیا کہ پچھلی مرتبہ عفت اور شہاب بھائی لندن گئے تھے تو عفت اپنی ایک غریب رشتہ دار کو ساتھ لے گئی تھی۔ عابدہ کا کام عفت کی نگہداری تھا۔ شہاب بھائی کی عدم موجودگی میں اسے ہسپتال سے لانا لے جانا پڑتا تھا۔ [illegible] کر جب تھوڑی دیر کے بعد عابدہ کو ایک ایسی فرم سے کام مل گیا جو کپڑوں میں بٹن ٹانکنے کی اچھی بھلی اجرت دیتی تھی۔ فرم کی وین پر سلے سلائے کپڑے گھر آ جاتے۔

عابدہ گنتی کر کے بٹن دھاگہ، سوئی انگشتانہ پکڑ بیٹھتی اور دن بھر بٹن ٹانکنے میں مشغول رہتی۔ صوفے کرسیاں [illegible] عفت کے پلنگ پر بھی کپڑوں کا ڈھیر لگنے لگا۔ ہسپتال جانے میں بھی ناغے ہونے لگے۔ دوائیاں بھی عابدہ کو بھول جاتیں۔ عفت نے منہ سے تو عابدہ کو کچھ نہ کہا لیکن جب وہ لاہور لوٹی تو پھر عابدہ کو وہیں چھوڑ گئی۔

مجھے پتہ نہیں کیوں اس خوف نے گھیر لیا کہ شاید شفقو جی اور مجھ سے بھی عابدہ جیسی کوئی بھول نہ ہو گئی ہو۔ اپنے کاموں میں گم، بچوں میں گھرے، عفت کو وہ توجہ نہ دے سکے ہوں جس کی اسے ضرورت تھی۔ ہم نے بھی [illegible] کے ساتھ عابدہ کا سا سلوک نہ کیا ہو۔

''کیا سوچ رہی ہو قدسیہ؟''

''کچھ نہیں جی۔ جب آپ جائیں گے تو میں..... ساتھ چلوں گی۔''

شام گہری ہو گئی تھی۔ شہاب بھائی اور میں میو ہسپتال پہنچے۔ گاڑی سے اترے تو شہاب بھائی کے پاؤں [illegible] تھے۔ انہوں نے ایک ٹانگ ہلکے سے جھٹکی پھر تھوڑا سا لنگڑا کر چلے۔ میں ان کے پیچھے پیچھے [illegible]ensive Care پہنچی۔ عفت آکسیجن ٹینٹ میں تھی۔ نیچے بیڈ کے ساتھ پیشاب کی تھیلی ٹنگی تھی۔ اوپر بلڈ اور غالباً شوگر کی کمی کے باعث [illegible] کی شفاف تھیلی نالی کے ذریعے سے عفت تک پہنچ رہی تھی۔

میں نے بغیر کسی سے پوچھے اپنا ہاتھ آکسیجن ٹینٹ میں ڈالا اور عفت کا بازو پکڑ لیا۔ اس نے لمحے بھر کو [illegible] کھولیں جیسے مجھے پہچان لیا ہو۔ ایک نرس چیل کی سی تیزی سے ہماری طرف آئی..... ''پلیز آپ ہاتھ ٹینٹ سے [illegible] ڈالیں۔''

میں نے اس جھڑکی سے مرعوب ہو کر ہاتھ کھینچ لیا۔

آپ دونوں باہر چلے جائیں۔ ڈاکٹر صاحب راؤنڈ پر آنے والے ہیں۔ ویسے بھی اس مریض کو کسی سے ملنے
ت نہیں ہے۔"

ہم دونوں اپنا سامان لے کر واپس کار میں پہنچ گئے۔ شہاب صاحب میرے ساتھ پیچھے بیٹھ گئے۔ مال روڈ تک
نے اپنی اپنی کھڑکی کا رخ کر کے باہر بتیوں کی طرف دیکھنے میں وقت صرف کیا۔ میرے آنسو بلاتکلف گر رہے
ل سے کچھ پہلے مجھے سسکیاں سی سنائی دیں۔ میں نے پلٹ کر شہاب بھائی کی طرف دیکھا۔ زندگی میں غالباً
ن کا نظم وضبط جواب دے گیا تھا۔ ان کا جسم ہچکولے کھا رہا تھا۔

"شہاب بھائی۔ اب کیا ہوگا؟"

وہ سسکیوں سمیت بولے۔ "دس از دی اینڈ قدسیہ۔ This is the End."

ہم دونوں نے ایک دوسرے کو کسی قسم کی تسلی نہ دی۔ ہم نہ انجام کے لیے تیار تھے نہ اس انجام کے آگے ہتھیار
مت تھی۔

شہاب بھائی مجھے چھوڑ کر اقبال شہاب کے گھر چلے گئے۔

پھر عفت اپنے اصلی گھر چلی گئی۔ اس کا جنازہ اس کے خاندان والے لے کر اسلام آباد چلے گئے۔ شاید خاں
و سارے حالات کا علم تھا لیکن مجھ سے انہوں نے کسی قسم کا ذکر نہیں کیا۔ اس کے بابا جی نے جیسے عفت کا تعاقب
ت اور بابا جی نور والے دونوں ہم سے جدا ہو گئے۔ ڈیرے پر بابا جی کے بڑے بیٹے خلیفہ ہو گئے۔ اب ڈیرہ پاک
کی نذر ہو گیا۔ ڈاکٹر فاضلی بھی ڈیرے سے جدا ہو گئے۔

پتہ نہیں یہ ہر بڑے آدمی کا نصیب ہے۔ اس کے جاتے ہی خاندان اور دوست دونوں ایک دوسرے کے
ن جاتے ہیں۔ حالانکہ دودھ اور پانی دونوں طیب ہیں لیکن دونوں ایک دوسرے میں ضم ہونے سے انکار کر دیتے
یت اور یگانگی کی بجائے حسد اور مقابلے کی ہوائیں چلنے لگتی ہیں لیکن کیا کیا جائے شاید یہ وہ قیمت ہے جو ہر بڑے
کی شہرت، ناموری اور بڑائی کی اپنے رب کے حضور پیش کرنے کا حکم ہے۔

خاں صاحب بھی ڈیرے پاک سے جدائی کے بعد کچھ دیر ستائے۔ ان کی تلاش کسی معمولی آدمی کی نہ تھی۔
کا رخ سخی رازی کی طرف ہو گیا۔ وہ نہ جانے کتنی دیر ان کے ڈیرے پر جاتے رہے۔ آخر ایک دن مجھ سے کہنے

"قدسیہ...... سخی رازی صاحب کا ڈیرہ لاہور سے قریباً بیس میل دور نہر سے کچھ دور ہے۔ سخی رازی صاحب
ہیں۔ ان کی آواز میں جو سندھی لب ولہجہ ہے، وہ بہت خوبصورت لگتا ہے۔ خاص کر جب وہ پنجابی بولتے ہیں۔ اردو
لوگ ان کے پاس آتے جاتے ہیں۔ باقی تم خود چل کر دیکھ لو...... یعنی اگر جانا چاہو تو...... میں مجبور نہیں کرتا۔"

ہم دونوں نہر سے ہو کر سخی رازی صاحب کے ڈیرے پر پہنچے۔ بابا جی نور والے جیسے انتظام تو نہ تھے نہ ویسے مخلوق
تھی۔ ڈیرے پر سخی رازی صاحب کی دانش برس رہی تھی۔ پیاسی زمین جیسے لوگ سیراب ہو رہے تھے۔

سائیں سخی رازی سے ہوتے ہواتے خاں صاحب واصف علی واصف صاحب تک پہنچے۔ واصف صاحب ان

کے پاس اپنی کتاب ''شب چراغ'' کا دیباچہ لکھوانے اردو بورڈ آئے تھے۔ خاں صاحب نے جلد ہی ان کی وسعت بھانپ لیا۔ پورے تین ساڑھے تین سال خاں صاحب اور انیق بیٹا ان کی رات کی محفلوں میں جاتے رہے۔ یہ والٹن کی جانب ایک سکول میں منعقد ہوتی تھیں۔

خاں صاحب قریباً گیارہ بجے ساتھ والے کمرے سے انیق کو جگاتے۔ دونوں دبے پاؤں باہر نکلتے۔ لاک کرنے کا تب رواج نہ تھا۔ عام لوگوں کے شکوک رفع کرنے اور انہیں تشفی اور تسلی کا پھاہا لگانے کے لیے واصف صاحب اپنا بیان جاری رکھتے۔ رات کو یہ محفل ٹوٹتی اور جس طرح دبے پاؤں باپ بیٹا جایا کرتے ویسے ہی خاموشی سے آتے۔

یہ ڈیرہ ذرا اپنی نوعیت کا تھا۔ یہاں ایک سکول ٹیچر براجمان تھا۔ سارے بیان ٹیپ پر ریکارڈ کیے جاتے۔ کا ریکارڈ رکھا جاتا۔ جب واصف صاحب کی مصروفیات ان بیانات کو تحریر میں لانے کی طرف مائل ہوگئیں تو یہ سلسلہ گیا لیکن خاں صاحب سے تعلق ہمیشہ برقرار رہا۔

سید سرفراز شاہ صاحب کا تعارف ممتاز مفتی کی وجہ سے ہوا۔ مفتی جی خود تلاش کے آدمی تھے۔ ان کے زندگی کا مقصد سمجھنے کی ہوس تھی۔ انہوں نے خاں صاحب کو سرفراز صاحب کے ڈیرے کا پتہ دیا۔ شاہ صاحب اقبال میں رہتے تھے۔ پیچھے رہائش تھی اور سامنے ڈرائنگ روم کو انہوں نے خلق کے بیٹھنے کے لیے مختص کر رکھا تھا۔ دیوار ساتھ معذوروں اور بوڑھوں کے لیے صوفے تھے۔ درمیان میں قالین بچھا تھا۔

اس ڈرائنگ روم کے دو حصے تھے۔ ایک بنیادی طور پر ڈائننگ روم تھا جس میں بیضوی میز کے گرد کر پھر ڈرائنگ روم تھا۔ دونوں کے درمیان جالی کا پردہ تھا۔ سرفراز شاہ صاحب کا طریقہ واردات بالکل مختلف تھا۔ شام مردوں سے ملتے اور جمعرات کی شام عورتوں کے مسائل سلجھاتے۔ ان محفلوں میں پہلے تو کچھ دیر وہ دنیا کے مسائل کے متعلق جنرل باتیں کرتے۔ پھر اندر بیضوی میز کے سرے پر جا بیٹھتے۔

ان کی خلیفہ ایک خاتون تھیں۔ وہ ہر آنے والے کو پہلے آیئے پہلے پایئے کے اصول پر ایک نمبر پکڑاتیں کمرے سے جونہی شاہ صاحب ریٹائر ہو کر اندر جاتے۔ مسائل پوچھنے والوں کو نمبر وار اندر بھیج دیا جاتا۔ گھر کے میں شاہ جی، ان کی والدہ، بیگم ساجدہ، بیٹیاں اور بیٹے رہتے تھے۔

خاں صاحب جب تک ہم لوگوں میں رہے۔ سرفراز شاہ صاحب کا رشتہ خاں صاحب سے نہیں ٹوٹا۔ سدھارے تو وہاں سے خاں صاحب کے نام شاہ جی کے خط آتے رہے۔ سرفراز شاہ صاحب چارٹرڈ اکاؤنٹینٹ بڑی فرموں میں پورے طور پر ان کا فنانس ڈیپارٹمنٹ سنبھالتے تھے لیکن کہیں ان کے اندر ایک ایسی تڑپ، ناآسودگی ضرور تھی جو انہیں ایک ان پڑھ مرشد کے پاس لے گئی۔

یہ مرشد انارکلی کی دہانے پر مسجد کے پیچھے گلی میں رہتے تھے۔ ان ہی مرشد صاحب نے شاہ جی کی تربیت انہیں کشف کے دہانے پر لا کر کھڑا کر دیا اور خلق کی خدمت کی پُڑیا چٹا دی۔ یہی علم شاہ جی کے اس وقت کام آیا جب نے اقبال ٹاؤن میں لوگوں کے سوالوں کا جواب علیحدگی میں دینا شروع کیا۔ یہاں بیضوی میز کی سرے والی کرسی پر

ت سنتے۔ پھر آنکھیں بند کر لیتے۔
تھوڑا سا لرزہ ان پر طاری ہو جاتا۔ وہ جیسے مستقبل کے پانیوں میں ڈوب کر موتی اور مونگے نکالتے۔ کبھی کبھی
بڑی اُن کے ہاتھ آ جاتی۔ عموماً دنیاداروں کو دولت، عزت، نوکری، تبدیلی، صحت کے مسائل درپیش ہوتے۔
نے بابے کی طرح ہمیشہ یہی کوشش کی کہ انسان مایوسی کی طرف قدم نہ بڑھائے۔

میرے تینوں بچوں کی ایک بڑی مشکل یہ تھی کہ چھوٹی عمر میں انہیں بابوں اور ڈیروں سے واسطہ پڑ گیا تھا۔ زیادہ
یو اور کم محنت کے باعث وہ اس طرح دنیا حاصل نہ کر پائے جس کی وجہ سے ان کا دین اور دنیا دونوں گڈمڈ ہو
میں تین بار خاں صاحب اثیر خاں کو شاہ جی کے ڈیرے پر ساتھ لے گئے لیکن پھر سرفراز صاحب نے اثیر میاں
دوست بنالیا۔ شاہ صاحب کی انتہائی مہربانی کہ وہ چیری کو اپنی کار میں بٹھا کر ڈرائیو پر لے جاتے اور اس طرح
تھیوں کی طرح سلجھاتے۔

یکدم شاہ جی اور خاں صاحب کا رشتہ سر سالٹ کھا گیا۔ کہاں تو شاہ جی مرشد کے درجے پر تھے۔ اب وہ خاں
اپنا والد سمجھنے لگے۔ یہ رشتہ کچھ ایسا گہرا اور خفیہ تھا کہ جب شاہ جی لندن سدھارے اور وہاں جوق در جوق لوگ ان
حاصل کرنے لگے تب بھی خاں صاحب اور ان میں خط و کتابت جاری رہی۔ فون پر رابطہ رہا۔

خاں صاحب کے جانے کے بعد یہ رشتہ کچھ دیر تو جوش و خروش سے جاری رہا لیکن جب وہ کیولری گراؤنڈ میں
گئے اور ان کے عقیدت مندوں کی زیادہ یورش ہو گئی تو میں اکیلی یہ رشتہ نبھا نہ سکی۔ ان کی بیگم ساجدہ نے البتہ بھ
رکھا۔ بنیادی طور پر ساجدہ ایک ادیبہ ہے۔ شاہ صاحب کی خواتین مریدنیاں جس ذوق و شوق سے ان کی طرف
تی ہیں، یہ رویہ ایک عام عورت کے لیے تکلیف دہ ہو سکتا ہے لیکن ساجدہ ادیب ہونے کے ناطے جلتی تو شاید
کی طرح ہو لیکن سمجھوتہ کرنے کی اس میں صلاحیت تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ زندگی بہت سے رنگوں کی قوسِ قزح ہے۔
س اسے اپنی مرضی سے یک رنگی نہیں کر سکتا۔ سر جھکانے میں ہی عافیت ہے۔

ہر رمضان کی ستائیسویں کے دن اُن کے چاہنے والے اقبال ٹاؤن میں جمع ہوتے رہتے ہیں۔ وہاں روزہ
یا جاتا ہے۔ دیگیں پکتی ہیں۔ بالالتزام مردانہ، زنانہ الگ رکھا جاتا ہے۔ کھانا اور پھل وافر مقدار میں کھلایا جاتا
پہلے یہ تقریب شاہ جی کی رہائش گاہ سے ملحقہ سڑک پار کر کے گراؤنڈ میں منعقد کی جاتی تھی لیکن اب کچھ فاصلے پر ایک
کے اندر روزہ کھلوائی کی رسم جاری ہے۔

شاہ جی مردانے کا خیال رکھتے ہیں۔ بار بار عورتوں کی طرف آتے ہیں۔ ان کی مروت کا یہ عالم ہے کہ اتنی مصروفیت
وجود اگر کوئی عورت ان کی خصوصی توجہ کی طالب ہو اور کسی مسئلے کا حل چاہتی ہو تو وہ سب سے ہٹ کر کرسی پر بیٹھ جاتے
ور جاری رہتا ہے۔ وہ آنکھیں بند کر کے کسی ایسی دنیا میں پہنچ جاتے ہیں جہاں سے انہیں سائل کا جواب پکڑنا ہوتا ہے۔

اب نہ اشفاق صاحب ہیں......

نہ بابا جی......

نہ یحییٰ رازی صاحب......